از جناب عبدالرحمٰن پروانہ اصلاحی

تفسیر بالرّائے

اور

اُس کی حیثیت

قرآن مجید جہاں تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر صحیفۂ ہدایت اور دستورِ زندگی ہے وہاں مضامین و معانی اور اسرار و حکم بحرِ زخار بھی ہے جس طرح قدرت کی بنائی ہوئی تمام چیزوں میں غور کرنے سے جدید انکشافات اور نت نئے منافع اور فائدے حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح قرآن میں غور و فکر کرنے سے بھی نئے نئے حقائق معلوم ہوتے رہیں گے۔ زمانہ علم و عقل کی خواہ کیسی ہی بلندیوں تک پہنچ جائے مگر یہ ہر مقام اور ہر بلندی پر زندگی کے پیدا شدہ مسائل میں قیامت تک انسان کی رہنمائی کرتا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں تفکر و تدبر کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

کتابٌ انزلنا مبارك ليدبروا آياته (سورۂ ص ۱۲/۲۹)	مبارک کتاب ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں۔
افلا يتدبرون القرآن ام على قلوب اقفالها (سورۂ محمد ۳/۲۴)	کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں۔
انا انزلناهُ قرآناً عربيا لعلكم تعقلون (سورہ نحل ۲۴)	ہم نے یہ قرآن عربی زبان میں اتارا ہے تاکہ تم لوگ سمجھو۔
وانزلنا اليك الذكر لتبيّن للناس ما نُزّل اليهم ولعلّهم يتفكرون (سورہ نحل - ۲۴)	اور ہم نے تمہاری طرف قرآن اتارا تاکہ جو لوگوں کے لئے اتارا گیا ہے اسے بیان کردو اور تاکہ لوگ اس میں تفکر کریں۔

جس طرح تمام آسمانی کتابوں میں قرآن کو یہ شرف حاصل ہے کہ جونہی نازل ہوا ترتیب و تدوین اور حفظ و صیانت

کے تمام مراحل طے کر لئے اسی طرح اسے یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اس کے نزول کے ساتھ ہی اس کی تشریح و توضیح کا بھی آغاز ہو گیا۔ خود مہبط وحی الٰہی یعنی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد اور قول و عمل اور آپ کے سنن و تقریرات قرآن کی تفسیر بن گئے۔ اور تفسیر کے اصطلاحی مفہوم کو اگر سامنے رکھا جائے تو اس اعتبار سے بھی آپ نے قرآنی کلمات و الفاظ کی وضاحت فرمائی۔

صحابۂ کرام نے جہاں اپنی زندگیوں کو قرآن کی روشنی میں سنوارا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم و تربیت میں تزکیہ و تطہیر کی منزلیں طے کیں وہاں وہ قرآن کے فہم و ادراک میں بھی دن رات کوشاں رہتے۔ قرآن کے معارف و حکم پر غور کرنے کے لئے صحابۂ کرام کے حلقے قائم تھے۔ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے حلقوں کے قیام کے لئے مؤثر الفاظ میں لوگوں کو شوق دلایا کرتے تھے۔ سنن ابی داؤد میں روایت ہے۔

"جو لوگ کسی جگہ جمع ہو کر اللہ کی کتاب پڑھتے اور باہم درس و مذاکرۂ قرآن کی مجلسیں قائم کرتے ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسکین اور رحمت کی بارش ہوتی ہے۔ اور ملائکہ ان کو ہر طرف سے گھیرے کھڑے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے مقربین کے حلقہ میں ان کا ذکر فرماتا ہے"[1]

قرآن فصیح عربی زبان میں نازل ہوا۔ صحابۂ کرام کی زبان عربی تھی۔ وہ اس کی فصاحت و بلاغت کے رموز سے اچھی طرح آشنا تھے۔ جن حالات اور واقعات میں قرآن نازل ہوا۔ وہ اس سے بھی بخوبی واقف تھے۔ جن خیالات و عقائد۔ اعمال و افعال پر قرآن نے بحث کی ہے۔ وہ زیادہ تر ان کے اپنے تھے۔ پچھلی قوموں کے احوال سے بھی وہ بے خبر نہ تھے۔ یہود و نصاریٰ کے عقائد و اطوار کی طرف قرآن نے جو اشارے کئے ہیں ان سے بھی وہ گونا گون تعلقات کی بنا پر اچھی طرح آگاہ تھے۔ لیکن اس کے باوجود ہم ان کے حالات میں پڑھتے ہیں کہ وہ برسوں قرآن حکیم پر غور و تدبر کرتے تھے۔

موطا امام مالک میں ایک روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ مسلسل آٹھ برس تک سورۂ بقرہ پر تدبر فرماتے رہے[1]

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس کی شرح مسوّیٰ میں لکھا ہے۔

"یہ اس لئے کہ وہ چاہتے تھے کہ قرآن میں تبحر حاصل کریں۔ اسباب نزول اور احکام میں نئے نئے استخراج کریں"

فہم قرآن میں ممتاز صحابہؓ قرآن کے رموز و نکات اور اس کے اسرار و حقائق کے سمجھنے میں تمام صحابہؓ کرام یکساں نہ تھے۔ کچھ وہ لوگ تھے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے زیادہ استفادہ کیا۔ اور کچھ ایسے

---

[1] سنن ابی داؤد۔ باب فی ثواب قراۃ القرآن

تھے جن کے استفادے کی بات مختصر تھی۔ کچھ ایسی ہستیاں بھی تھیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے فہم و بصیرت اور تفسیر و تاویل میں مخصوص صلاحیتوں سے نوازا۔ صحابہ کرامؓ میں جن حضرات سے تفسیری نکات منقول ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے دس کے نام لئے ہیں یعنی خلفائے اربعہؓ۔ عبداللہ بن مسعودؓ۔ عبداللہ بن عباسؓ۔ ابی بن کعبؓ۔ زید بن ثابتؓ۔ ابوموسیٰ اشعریؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ[1]

لیکن اس سلسلے میں کچھ اور صحابہ کرام کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ۔ حضرت ابوہریرہؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہم مگر ان میں سے جن حضرات نے تفسیر کے باب میں شہرت و دوام حاصل کی۔ اور ذخیرۂ تفسیر میں معتدبہ اضافہ کیا۔ اور اپنے تلامذہ کا مستقل حلقہ چھوڑا اور وہ صرف چار ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ۔ حضرت علیؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ[2]

دورِ رسالت کے بعد اسلامی حکومت کے حدود وسیع ہوئے۔ تو صحابہ کرام کے تلامذہ مختلف مرکزوں میں پھیل گئے۔ علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں :-

> " اہل مکہ علم تفسیر میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ کیونکہ وہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اصحاب و تلامذہ ہیں۔ جیسے مجاہد بن جبیرؒ۔ عطا بن ابی رباحؒ۔ اور عکرمہؓ مولیٰ ابن عباسؓ، اسی طرح حضرت ابن عباسؓ کے شاگردوں کے شاگرد بھی علم تفسیر میں پیش پیش ہیں۔ جیسے طاؤس بن کیسانؒ۔ جابر بن زید ازویؒ۔ سعید بن جبیر وغیرہ۔ اسی طرح کوفہ میں عبداللہ بن مسعودؓ کے اصحاب کو تفسیر میں دوسروں پر فوقیت حاصل ہے۔ یہی حال مدینہ میں زید بن اسلمؒ جیسے بزرگوں کا ہے امام مالکؒ نے انہی زید بن اسلم سے تفسیر کا علم حاصل کیا۔ نیز اُن کے بیٹے عبدالرحمٰن نے اور عبداللہ بن وہب نے بھی "[3]

ان کے علاوہ مدینہ میں ابوالعالیہ محمد بن کعب القرضی۔ اور عراق میں علقمہ بن قیس۔ مسروق الاسود بن یزید۔ مرۃ الہمدانی۔ عامر الشعبی۔ حسن بصری۔ قتادہ وغیرہ وہ ممتاز تابعین ہیں جنہوں نے صحابہ کرام سے استفادہ کے بعد تفسیریں بیان کیں۔ اور ان کے ذریعہ تفسیری روایتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

ابتدا میں تفسیروں کی نوعیت | ابتدا میں احادیث کے انداز پر تفسیری اقوال نقل ہوتے رہے پھر تبع تابعین کے دور میں حدیث کی کتابوں میں تفسیر کے ابواب قائم ہوئے۔ ہر سورہ اور ہر آیت کے متعلق جو روایت ملی، وہ حدیث کی کتابوں میں درج کی گئی۔

---

[1] الاتقان ج۲ ص ۱۸۷ [2] التفسیر والمفسرون محمد حسین الذہبی ج۱ ص ۱۸ تا ۹۸ [3] مقدمہ ابن تیمیہ فی اصول التفسیر ص ۱۵

زید بن ہارون متوفی ۱۱۷ھ - شعبہ بن الحجاج - متوفی ۱۶۰ھ - وکیع بن الجراح - متوفی ۱۹۷ھ - سفیان بن عیینہ متوفی ۱۹۸ھ - روح بن عبادہ متوفی ۲۰۵ھ - عبدالرزاق بن ہمام متوفی ۲۱۱ھ - آدم بن ابی ایاس متوفی ۲۲۰ھ - عبد بن حمید متوفی ۲۴۹ھ - وغیرہ - ائمہ حدیث کی بدولت احادیث کی کتابوں میں تفسیری روایات کا اچھا خاصہ حصہ تفسیر کے ابواب کے تحت جمع ہوگیا۔ پھر اس کے بعد باقاعدہ تفسیر کا فن وجود میں آگیا اور ہر آیت کی تشریح قرآنی ترتیب کے مطابق کتابی صورت میں مرتب ہوئی۔

اس مرحلے میں امام ابن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ - امام ابن جریر الطبری متوفی ۳۱۰ھ - امام ابوبکر بن المنذر نیشاپوری متوفی ۳۱۸ھ - امام ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ - ابوالشیخ بن حبان متوفی ۳۶۹ھ - حاکم متوفی ۴۰۵ھ - ابوبکر بن مردویہ متوفی ۴۱۰ھ - جیسے ائمہ کرام صحابہ نے، صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے علماء سے روایات درج کی ہیں اور اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی۔ سوائے ابن جریر الطبری کے جو ہر آیت کی تشریح کے بعد متقدمین کے اختلافات بھی درج کرتے ہیں۔ پھر خود ان میں سے ایک کو ترجیح دے کر اس کے وجوہ بھی لکھ دیتے ہیں۔ کہیں استنباط مسائل اور وجوہ اعراب سے بھی بحث کرتے ہیں۔[1]

تفسیروں میں اختلاف و تنوع | انسانی ذہن و فکر میں ہمیشہ ارتقاء ہوتا رہتا ہے اور تاریخ کے ہر موڑ پر ذہنی اور فکری تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد عہد صحابہؓ میں ہر شخص کے غور و فکر کے انداز میں کچھ نہ کچھ فرق رہا۔ اختلاف طبائع اور صلاحیتوں کے اعتبار سے قرآن حکیم میں جب انہوں نے غور و فکر کرنا شروع کیا تو اختلاف و تنوع کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ بعض صحابہ کرامؓ نے قرآن کی آیت کا مطلب سن کر یا آپ سے سنے بغیر بیان کر دیا۔ پھر جب مسائل و معاملات پیدا ہوتے اور ان کے لئے استنباط و استخراج کی ضرورت پیش آئی تو جس صحابی کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل کا جو سرمایہ محفوظ تھا اور اس نے جیسا کچھ سمجھا تھا اس کی روشنی میں اس نے جدید امور و معاملات کی نسبت اپنی رائے ظاہر کر دی۔ اس طرح اب اختلاف رونما ہونے لگا۔ اور احکام و مسائل میں تنوع اور مختلف نقطہ نظر سامنے آنے لگے۔ اس سلسلے میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ارشاد حقیقت پر مبنی ہے۔

"میں نہیں چاہتا کہ صحابہ میں اختلاف رونما نہ ہوتا۔ کیونکہ اگر فروعی مسائل میں صحابہ کا ایک ہی قول ہوتا تو لوگوں کو بڑی دشواری ہوتی۔ صحابہ کرام ائمہ دین تھے جن کی پیروی موجب خیر و برکت اور باعث فلاح و نجاح ہے۔ اس بنا پر کسی بھی صحابی کے قول پر عمل کو سنت تصور کیا جائے۔"[2]

---

[1] التفسیر والمفسرون ص ۱۴۰ تا ۱۴۲ [2] الاعتصام للشاطبی ج ۳ ص ۱۱

عہدِ تابعین میں اختلاف کا دائرہ اور وسیع ہوا۔ دوسری قوموں کے افراد حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ معیشت و معاشرت میں تبدیلیاں ہوئیں۔ سیاسی و سماجی تغیرات رونما ہوئے۔ نئے نئے میلانات و رجحانات پیدا ہوئے۔ ان حالات میں اسلامی وحدت فکر اور بے لوث ذہنی اجتہاد و استنباط کی فضا اپنی اصل شکل میں قائم نہ رہ سکی۔ فکر و نظر میں انتشار کے باعث متعدد مکاتب فکر کا ظہور ہوا۔ ان مکاتب فکر کا دامن اتنا بڑھا کہ جزئی اور فروعی مسائل کے علاوہ اصولی اور بنیادی عقائد مثلاً صفات باری۔ خلق قرآن۔ جبر و قدر۔ ایمان و عمل کا تعلق، خیر و شر کی حقیقت۔ مرتکب کبیرہ کا حکم وغیرہ بھی تفسیروں میں موضوع بحث بن گئے۔ اور اس بحث و جدال نے متعدد فرقوں کی صورت اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قرآنی آیات کی تشریح و توضیح ہر فرقہ اپنے میلان و رجحان کے مطابق کرنے لگا۔

چوتھی صدی ہجری کے بعد مسلمانوں میں مختلف علمی تحریکیں بھی پیدا ہوئیں۔ صرف و نحو۔ بلاغت و معانی۔ فقہ و منطق و فلسفہ، کلام اور تصوف کا رواج ہوا۔ ان علوم کے حاملین نے اپنے اپنے فنی زاویہ نظر سے الفاظ و آیات کی تشریح میں بحثیں شروع کیں۔ علم و ادراک کے گوشوں میں جلا آئی۔ اور ارتقاء و تغیر کے تقاضے بروئے کار آئے۔ اور روایات کے ساتھ اجتہاد کا بھی دروازہ کھل گیا۔ تفسیروں میں جہاں تنوع، رنگا رنگی آئی۔ وہاں قرآن مجید کی تفسیر میں تاویل و توجیہ کا ایسا باب کھل گیا جس سے قرآن مجید، فقہی، کلامی اور فلسفیانہ بحثوں کا میدان بن گیا۔ ہر مفسر کوشش کرنے لگا کہ وہ جس مسلک سے تعلق رکھتا ہے اس کو قرآن کی آیت سے ثابت کرے اور دوسرے مسلک کے لوگوں کی تردید میں ان سے استدلال کرے۔

تفسیر بالرائے کی ممانعت | ارتقاء کے اس موڑ پر قدرۃً یہ سوال پیدا ہوا کہ تفسیر کے صحیح حدود کیا ہیں۔ اور قرآن میں غور و فکر اور استخراج معانی کا دائرہ کتنا وسیع ہے؟ اس سلسلے میں دو گروہ ہو گئے۔ ایک فریق تو اس بات کا حامی تھا کہ تفسیر میں ماثور و منقول ہی پر اکتفا کیا جائے۔ اور اپنی طرف سے کوئی بات نہ کہی جائے۔ کیونکہ اس سے غیر ضروری بحثوں کا دروازہ کھلتا ہے اور ایمان کے داعیوں اور تقاضوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس فریق کے نزدیک تفسیر میں صرف ماثور کا اعتبار کیا جائے گا۔ اور مجرد رائے کو حرام سمجھا جائے گا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

مَن قال فی القرآن بغیر علم فلیتبواء مقعدہٗ من النار[1]	قرآن مجید کے بارے میں بغیر علم کے جس نے کچھ کہا اسے چاہیے کہ اپنی جگہ دوزخ میں بنا لے

ایک اور حدیث میں فرمایا۔ کہ

من قال فی القرآن برائہ فاصاب فقد اخطاء[2]	جس نے قرآن کے سلسلے میں اپنی رائے سے کوئی بات کہی اور اس کی بات صحیح بھی ہوئی تو اس نے غلطی کی۔

[1] ترمذی۔ یہ حدیث امام ترمذی کے نزدیک غریب ہے [2] مشکوۃ و جامع ترمذی

اصحابِ حدیث و روایت کے نزدیک وہ شخص خاطی اور گمراہ ہے جو تفسیرِ رسولؐ سے گریز کرکے اپنے جی سے قرآن مجید کی کوئی تفسیر کرے۔ اس قسم کی تفسیر بالرائے سے گمراہیوں کا دروازہ کھل گیا۔ اور باطنیہ، شیعہ، معتزلہ، خوارج مرجیہ وغیرہ مختلف گمراہ فرقے پیدا ہو گئے جنہوں نے قرآن کے ظاہر و باطن کے معنی الگ الگ قرار دئے۔ بعد میں بدعت اور غرض پرستی بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئی۔ اس لئے بے شمار مفاسد پیدا ہو گئے۔

لیکن بعد کے دور میں نئے نئے مسائل نے نئی نئی الجھنیں پیدا کر دیں۔ جن کے ازالہ کے لئے اصحابِ روایت کے پاس کوئی حربہ نہ تھا۔ بالخصوص جب مسلمانوں میں یونانی علوم و فنون کا رواج ہوا اور ان کے عقائد و افکار دوسری قوموں سے متاثر ہوئے تو اس وقت ان مشکلات اور الجھنوں کا عقلی جواب دینے کی ضرورت پیش آئی۔ جس کے لئے علمائے اسلام کا ایک گروہ آگے بڑھا۔ اس زمانہ میں عقلی تفسیروں کی افادیت محسوس کی گئی۔ اس کے نتیجہ میں امام رازی۔ بیضاوی۔ نسفی۔ خازن۔ ابوحیان۔ نیشاپوری۔ سیوطی۔ شربینی۔ ابوالسعود اور آلوسی نے گو عقلی تفسیریں لکھ کر تفسیر و تاویل کے دائروں کو کافی وسعت دی۔ لیکن اثر و روایت کے جادۂ مستقیم سے انحراف نہیں کیا۔ ان کی کتابوں میں جو فرق و اختلاف پایا جاتا ہے وہ ان کے اپنے اپنے ذوق اور طریقۂ تعبیر کی وجہ سے ہے۔

حالات کی تبدیلی سے متکلمینِ اسلام کے گروہ نے یہ محسوس کیا کہ عقل و رائے کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ قرآن تو ایک ابدی صحیفہ ہے جس کی تعبیر و تشریح ہر دور کے حالات اور جدید علوم و فنون کے اعتبار سے کی جائے گی اس نے خود بار بار تدبر و تعقل کی دعوت دی ہے۔ اس لئے لامحالہ ہر دور کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر ہی اس کی تفسیر بھی کرنی چاہئے۔

رائے کی قسمیں | تفسیر بالرائے کی ممانعت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن کے مطالب و معانی کے سمجھنے میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے۔ اگر یہ مطلب ہوتا تو پھر قرآن فہم و تدبر کی تلقین کیوں کرتا۔ اس طرح تو قرآن کا درس و مطالعہ بھی بے سود ہو جاتا۔ علامہ شاطبی نے موافقات میں تحریر فرمایا ہے کہ

"رائے کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ رائے جو کتاب و سنّت کے مطابق اور عربی زبان کے قواعد کے موافق ہو۔ اس رائے سے اعراض اور غفلت ممکن نہیں ہے۔ دوسری وہ رائے ہے جو نہ دلائل شرعیہ کے موافق ہو اور نہ کلام عرب کے قواعد کے مطابق ہو۔ اس قسم کی رائے بلاشبہ قابلِ مذمت ہے۔"[1]

ابوبکر جصاص رازی نے احکام القرآن میں لکھا ہے کہ

---

[1] موافقات للشاطبی جلد ۳

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

من قال فی القرآن بوائہ فاصاب فقد اخطاء

اس شخص کے متعلق ہے جو قرآن کی تفسیر میں اصول سے ہٹ کر وہ بات کہے جو اس کے خیال میں آ جائے اور اگر کوئی شخص آیاتِ قرآنیہ کا مطلب بیان کرے اور اس کو ایسے معانی پر محمول کرے جن پر سب کا اتفاق ہے۔ تو وہ شخص قابلِ تعریف اور اجر کا مستحق ہے۔ اور وہ ان لوگوں میں ہے جن کے متعلق خدا نے ارشاد فرمایا ہے۔

لعلمہ الذین یستنطبونہ منھم[1]

تفسیر بالرائے میں لغوی معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ ایک مخصوص اصطلاح ہے اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اپنے ذہن میں ٹھہرا لی جائے۔ اور کسی طرح قرآن کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کر دیا جائے۔

تفسیر بالرائے کے متعلق علماء کی تصریحات

تفسیر بالرائے کا مطلب کیا ہے اور شارعؑ کا اس سے مقصود کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لئے علمائے اسلام کی مندرجہ ذیل تصریحات قابلِ غور ہیں۔ علامہ قرطبی اندلسی فرماتے ہیں:۔

"کسی معاملہ میں آدمی کی خود اپنی ایک رائے ہو اور اس کی جانب خواہش نفس کی بنا پر اس کا طبعی میلان بھی ہو اور وہ اپنی اپنی رائے اور خواہش کے مطابق قرآن کی اس لئے تفسیر کرے کہ اپنی غرض فاسد کی صحت پر استدلال کر سکے۔"[2]

علامہ خازن لکھتے ہیں:۔

"تفسیر بالرائے کی ممانعت اس شخص کے بارے میں وارد ہوئی ہے جو اپنی خواہش نفس کے مطابق قرآن کی تفسیر کرے۔ جیسے کوئی شخص اپنی بدعت کا جواز ثابت کرنے کے لئے قرآن کی بعض آیتوں سے استدلال کرے۔ حالاں کہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ آیت کا مطلب کچھ اور ہی ہے لیکن اس کا مقصد یہ ہو کہ وہ مقابل کو ایسی چیز سے دھوکا دے جو اس کی بدعات کے دلائل کو مضبوط کرے جیسا کہ باطنیہ خوارج اور دوسرے گمراہ فرقے اپنی اغراض فاسدہ کے لئے کرتے ہیں۔"[3]

امام غزالی نے تفسیر بالرائے کے متعلق تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"یہ کہ زیر بحث آیت کے موضوع سے متعلق کسی شخص نے پہلے سے کوئی رائے قائم کر لی ہو۔ اور اس

---

[1] احکام القرآن جلد ۲ ص ۸۸ [2] تفسیر قرطبی جلد ۱ ص ۳۳ [3] تفسیر خازن جلد ۱ ص ۲۶

کی جانب اس کا میلان و رجحان ہو۔ پھر وہ آیت قرآنی کی تاویل میں اس طرح کھینچ تان کرے کہ وہ اس کی رائے کے مطابق ہو جائے اور اپنی تصحیح غرض کے لئے اس سے حجت اور دلیل قائم کر سکے اور اگر اس کی مخصوص رائے اور رجحان کا سوال نہ ہوتا تو پھر وہ آیت زیر بحث کی تفسیر و تاویل کی طرف توجہ بھی نہ کرتا۔ بالعموم یہ تفسیر بالرائے اس علم کے ساتھ ہوتی ہے کہ آیت زیر بحث کی تفسیر مقصود نہیں ہوتی۔ بلکہ اپنی بدعت کو صحیح اور جائز ثابت کرنے کے لئے حریف کو التباس میں مبتلا کر کے وہ آیات قرآنی سے حجت لاتا ہے۔ اور کبھی یہ تفسیر بالرائے جہالت پر بھی مبنی ہوتی ہے اور آیت زیر بحث اگر محتمل ہوتی ہے یعنی اس سے دونوں پہلو ثابت ہو سکتے ہیں تو اس کی فہم اپنے اغراض کے توافق پر مائل ہوتی ہے۔ اور آیت کا مفہوم اپنی غرض اور خواہش کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی رائے کے جانبدارانہ پہلو کو ترجیح دیتا ہے۔ اور اس طرح وہ تفسیر بالرائے کا ارتکاب کرتا ہے۔ یہ وہ رائے ہے کہ اگر پہلے سے اس نے قائم نہ کر لی ہوتی تو وہ تفسیر کا یہ پہلو اختیار نہ کرتا۔ لوگوں کو بہکانے اور اپنے مذہب باطل کی ترویج کے سلسلے میں اس طرز عمل کو باطنیہ نے خوب استعمال کیا۔ انہوں نے قرآن کو اپنی رائے اور مذہب کے موافق ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ حالاں کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ آیات قرآنی کا جو مفہوم یہ لے رہے ہیں وہ قطعاً مراد نہیں ہے۔ یہی وہ مواقع ہیں جہاں تفسیر بالرائے ممنوع ہے۔ کیونکہ ایسے مواقع پر "رائے" سے مراد رائے فاسد ہے۔ جو ہوا و ہوس سے تو مطابقت رکھتی ہے لیکن اجتہاد صحیح سے جیسے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔[1]"

تفسیر بالرائے کے حدود | بہر حال تفسیر میں رائے بالکلیہ ممنوع نہیں ہے۔ بلکہ اگر رائے محمود ہو تو اس سے قرآنی حقائق کے بہت سے مخفی پہلو روشن ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ تفسیر کرنے والا شخص دینی علوم پر گہری نظر رکھتا ہو۔ عربی زبان کے قواعد اور اسالیب پر اسے عبور بھی ہو۔ بلاغت و معانی کی باریکیوں کو بھی سمجھتا ہو۔ احادیث و آثار کے ذخیرہ سے بھی واقف ہو۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے دل میں نور ایمان ہو تقویٰ و خلوص نیت سے بھی بہرہ یاب ہو تو ایسا شخص کسی آیت کا مفہوم بیان کرے تو اس کی تفسیر، تفسیر بالرائے نہ ہو گی۔ چنانچہ علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں:۔

"جس نے قرآن کی تفسیر میں لغت اور شریعت کے اعتبار سے اپنے علم کے مطابق گفتگو کی۔ اس

---

[1] اخبار العلوم جلد ۱ ص ۲۶۱

پر کوئی حرج نہیں۔ اسی لئے ان سلف سے اور بعد کے علماء سے تفسیر میں بہت سے اقوال منقول ہیں۔"[1]

مشہور مفسر ابوحیان اندلسی فرماتے ہیں۔

"جس نے غور و فکر سے کام لیا اور علم و نظر کے اصولوں کے مطابق قرآن کی تفسیر کی۔ وہ[2] اس حدیث میں داخل نہیں۔ اس کی تفسیر بالرائے نہیں ہوگی۔ اور نہ خطا کی طرف منسوب ہوگی۔"

اہلِ نظر کے نزدیک آیات کی تاویل بھی جائز ہے اور تاویل کا تعلق زیادہ تر عقل و رائے ہی سے ہے

علامہ سیوطی۔ امام بغوی اور کواشی سے نقل کرتے ہیں کہ

"تاویل یعنی آیت کو اجتہاد و استنباط کے طریق پر ایسے مفہوم پر محمول کرنا جو سیاق و سباق کے مطابق ہو اور آیت میں اس کی گنجائش ہو اور وہ مفہوم کتاب و سنت کے خلاف بھی نہ ہو علمائے تفسیر کے لئے ناجائز اور ممنوع نہیں ہے۔"[3]

بہرحال رائے محمود بھی ہو سکتی ہے۔ اور مذموم بھی۔ اگر اصول و ضوابط کے تحت ہو تو اس سے فہم قرآن کی راہیں کھلتی ہیں اور اگر ان سے انحراف ہو تو بے جا تاویلات کا بھی دروازہ کھلتا ہے۔ محتاط مفسرین نے تفسیر بالرائے کے حدود کا ہمیشہ لحاظ رکھا ہے اور ان کی مساعی جمیلہ کی بدولت تفسیر کے ذخیرہ میں گراں مایہ اضافہ ہوا۔

تفسیر بالماثور کا کمزور پہلو اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ تفسیر بالماثور ہمارے لئے کافی ہے اور ہمیں عقل و فہم کو کام میں نہیں لانا چاہیے۔ تو یہ اس کی کوتاہ فہمی ہے۔ قرآن پر جب بھی غور و فکر کیا جائے گا اور گہرائی سے مطالعہ کیا جائے گا۔ تو تفسیر بالماثور زیادہ کارآمد نہیں ثابت ہوگی۔ اور نہ ہر زمانہ اور ماحول میں سازگار ہو گی۔ کیونکہ حدیث کی صحیح ترین کتابوں میں تفسیر کے ابواب اس قدر مختصر ہیں کہ کسی سورہ کے ایک یا دو لفظوں اور کسی سورہ کی صرف ایک یا دو آیتوں کے متعلق روایات درج کی گئی ہیں۔ اگرچہ یہ روایات قرآن کی تفسیر کے لئے نہایت اہمیت رکھتی ہیں۔ مگر ان سے خود ان کا کوئی گوشہ سیراب نہیں ہوتا۔ علامہ سیوطی نے "الاتقان فی علوم القرآن" کی آخری فصل میں ان تفسیری روایتوں کو جمع کر دیا ہے جو صحابہ کے توسط سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں اور وہ کل ان کی کتاب کے بیس صفحوں سے بھی کم ہیں۔ پھر وہ بھی زیادہ تر الفاظ کے معانی کے متعلق ہیں۔

ان کے علاوہ تفاسیر کے وہ مجموعے جن میں آثار و اقوال کو جمع کیا گیا ہے۔ ان میں ہر قسم کی روایات درج ہو گئی ہیں۔ ائمہ جرح و تعدیل نے جب راویوں اور روایتوں کی جانچ کی۔ تو تفسیری روایات کا بڑا حصہ ان کے رواۃ کے ضعف کی بنا پر مشکوک ثابت ہوا۔ کیونکہ ضحاک بن مزاحم، مقاتل بن سلیمان۔ ابوصالح مصری ——

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۶ [2] البحر المحیط جلد ۱ ص ۱۳ [3] الاتقان جلد ۲ ص ۱۸۰

محمد بن سائب کلبی۔ السدی۔ محمد بن مروان۔ بشر بن عمار اور عوفی وغیرہ جن سے زیادہ تر یہ روایتیں آئی ہیں۔ جانچنے سے کمزور بلکہ ان میں سے بعض وضاع نکلے[1]

حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے نام سے تفسیر کی روایات زیادہ تر موضوع ثابت ہوئیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے قرآن کی ہر آیت اور ہر لفظ کی تفسیر میں ۱۶۶۰ روایتیں نقل کی گئی ہیں جن میں سے امام شافعیؒ کے قول کے مطابق زیادہ سے زیادہ سو ایسی ہیں جو صحیح مانی گئی ہیں[2]

پھر منقولی تفسیروں میں اسرائیلیات کا بڑا حصہ بھی شامل ہوگیا۔ جن میں زیادہ تر حصہ موضوعات و خرافات سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکابر ائمہ نے ان پر سخت تنقیدیں کیں۔

امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے۔

"تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں۔ مغازی۔ ملاحم اور تفسیر"[3]

تفسیر میں اجتہاد و رائے کی ضرورت | جب یہ معلوم ہوگیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرآن کی تفسیر کا کچھ ہی حصہ ہم تک پہنچا ہے تو باقی حصے کے بارے میں نصوص صریحہ کی روشنی میں ہم قرآن سمجھنے کی کوشش کریں۔

صحابہ کرامؓ سے جو تفسیر مرفوعاً ثابت نہیں لامحالہ اسے ان کی فہم و رائے ہی قرار دیا جائے گا اور جب انہوں نے ایک طرح ڈال دی ہے تو ہم بھی ان کے راستہ پر چلیں۔ جس طرح فقہی مسائل میں ہم ان سے استفادہ کرتے اور عربیت میں ان کو حجت سمجھتے ہیں۔ اسی طرح قرآن کے سلسلے میں بھی ہم اپنی فہم و رائے سے کام لیں۔

ان اقوال میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے ہوئے نہیں ہیں ظاہر ہے کہ وہ صحابہ کرامؓ کا اپنا فہم سمجھے جائیں گے جسے اللہ تعالیٰ نے فہم و خرد سے نوازا ہے اور لغت و سنت کا وہ علم بھی رکھتا ہے تو وہ بھی صحابہ کرام کی تقلید کرتے ہوئے اپنی فہم سے کام لے سکتا ہے۔

تفسیر بالماثور کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ سختی کے ساتھ آثار سلف سے تجاوز نہیں کرتے وہ بھی سلف کے مختلف اقوال کو سامنے رکھ کر استنباط و ترجیح سے کام لیتے ہیں اور یہ اختیار و تمیز فہم بالرائے کے سوا اور کیا ہے!۔

جب یہ ثابت ہے کہ تفسیر بالماثور کا بہت کم حصہ صحیح طریقہ پر پہنچا ہے تو دوسرے حصوں کے لئے فہم و رائے کا دروازہ بند نہیں کیا جا سکتا۔ اخبار آثار سے بھی تائید ہوتی ہے۔ کہ اصحاب فہم و تدبر کے لئے قرآن میں غور و فکر

[1] مرأۃ التفسیر ص ۲۰ تا ۲۸ [2] الاتقان جلد ۲ ص ۱۹۵ [3] تذکرۃ الموضوعات شیخ محمد بن طاہر ص ۸۳۔

کی کافی گنجائش ہے جیسا کہ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے :-

" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کوئی ایسی چیز نہیں عطا فرمائی جسے لوگوں سے چھپایا ہو سوائے اس کے کہ اللہ عزوجل اپنے کسی بندے کو فہم قرآن کی نعمت عطا فرمائے "[1]

مقصد یہ ہے کہ کتاب اللہ کی فہم کا دروازہ وسیع ہے۔ خدا جسے چاہے عطا کرے۔ اللہ تعالیٰ کے خصوص بندوں کو ہمیشہ یہ نعمت حاصل ہوتی ہے۔ اولوالالباب اپنی حکمت و بصیرت قرآن سے استنباط کرتے اور اپنی عقل و فہم کو قرآن کے علم و معرفت میں استعمال کرتے ہیں۔

فہم قرآن کے سلسلے میں اہل علم کا یہی طریقہ رہا ہے کہ پہلے انہوں نے قرآن کو قرآن ہی سے سمجھنے کی کوشش کی۔ کیونکہ قرآن ایسی کتاب ہے جس میں کہیں اجمال ہے تو کہیں دوسری آیت میں اس کی تفصیل ہو جاتی ہے اس کے بعد انہوں نے سنت کو ذریعۂ فہم بنایا۔ کیونکہ رسول شارح قرآن ہیں۔ پھر اقوالِ صحابہ کو پیش نظر رکھا۔ کیونکہ انہوں نے براہِ راست صحابہ سے استنباط کیا۔ پھر تابعین کے اقوال کو بھی دیکھا۔ پھر جب اشکال رہ گیا تو انہوں نے فکر و رائے سے کام بھی لیا۔ یہی طریقہ زیادہ محتاط اور اولیٰ ہے۔ اور اس کی تائید حضرت معاذ بن جبلؓ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے یمن بھیجتے ہوئے سوال کیا۔ کس چیز سے فیصلہ کرو گے؟ معاذؓ نے عرض کیا، کہ اللہ کی کتاب سے۔ فرمایا، اگر اس میں نہ مل سکے؟ عرض کیا تو سنّت سے۔ فرمایا اگر سنّت میں بھی نہ پایا؟ عرض کیا، اپنے اجتہاد و رائے سے کام لوں گا۔ یہ سن کر آپؐ نے سینہ پر تھپکی دیتے ہوئے فرمایا :-

" الحمد للہ! جس نے رسولؐ کے قاصد کو اس امر کی توفیق بخشی جو اللہ کے رسول کو پسند ہے "[2]

ارباب علم کے لئے زندگی کے ہر باب میں حضرت معاذؓ کا اسوہ قابل محبت رہا۔ تو فہم قرآن کے سلسلے میں دلیل راہ کیوں نہ بنے۔ حقیقت یہ ہے کہ فہم قرآن کا دائرہ تنگ نہیں ہے۔ بلکہ قرآن کی حکیمانہ اور ابدی تعلیمات کا تقاضا ہے کہ اس میں ہمیشہ تعقل و تفکر سے کام لیا جائے۔ جتنی زیادہ گہرائی سے اس کا مطالعہ کیا جائے گا اس قدر خدا کی حکمت و معرفت کی دولت ہاتھ آئے گی۔ اس سلسلے میں امام غزالی نے بڑی اچھی بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں :-

" قرآن کریم میں جملہ دینی علوم موجود ہیں۔ بعض صراحت کے ساتھ، بعض اجمالی طور پر۔ بعض نسبتاً تفصیل سے۔ لیکن ان سے بہرہ ور ہونے کے لئے گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ نیز حقائق کی بصیرت بھی لازمی ہے۔ اور یہ کام صرف اس طرح نہیں بن سکتا کہ زبان سلف پر جو ظواہر تفسیر چلے آرہے ہیں ان پر اکتفا کر لیا جائے بشرطیکہ وہ تفسیر ماثور کے خلاف نہ ہو "

---

[1] مشکوٰۃ شریف کتاب القصص ص ۳۰۰ بحوالہ بخاری [2] جامع ترمذی کتاب القضاء

لیکن بہت سے امور ہیں جو تفسیر ماثور سے ماوراہیں۔ جیسا کہ عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:۔

من اراد علم الاولین والآخرین فلیتدبّر القرآن — جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اولین و آخرین کا علم حاصل کرے اسے چاہیئے کہ قرآن میں تدبر کرے۔

اور ظاہر ہے کہ تدبر فی القرآن کے لئے تعمق فی الفہم ضروری اور ناگزیر ہے جو ظاہر الفاظ و معانی پر انحصار کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے لئے اشارات اور مقاصد کا سمجھنا بھی ضروری ہے۔

۲۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی صفات و افعال کا بیان بھی ہے۔ اور اس کی ذات قدسی کا ذکر بھی ہے۔ اس کے اسمائے حسنیٰ بھی آئے ہیں۔ ان چیزوں کو سمجھنے کے لئے فانی چیزوں کی مشابہت سے تنزیہہ کے ساتھ ساتھ صرف ظواہر پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ فہم و تدبر کی بھی ضرورت ہے۔ تاکہ بیان موتلف کو جمع کیا جا سکے۔ اور قول مختلف کی نفی کی جا سکے۔

۳۔ آثار سلف بھی اس مسلک کی تائید میں موجود ہیں۔ کہ قرآن کے سمجھنے کے لئے فہم و تدبر سے کام لینا چاہیئے چنانچہ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے:۔

"جس نے قرآن کو سمجھا اس کے ہاتھ میں سارے علوم کی کنجی آ گئی"۔

ظاہر ہے یہ بات اس وقت تک ممکن نہیں جب تک فہم میں تعمق سے کام نہ لیا جائے۔

۴۔ خود قرآن کی آیات تعمق فی الفہم کی دعوت دیتی ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (البقرہ ۲۶۹) — اور جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دیا گیا۔

مفسرین سلف حکمت کی تفسیر کرتے ہوئے اس کے معنی فہم قرآن کے بیان کئے ہیں تو جب اللہ تعالیٰ خود فہم قرآن کو خیر کثیر سے تعبیر فرماتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس طرح وہ ان لوگوں کو جو فہم و تعمق پر قادر ہیں، بحث و تامل اور غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

۵۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو دعا دی۔

اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّينِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِيلَ[1] — اے خدا ابن عباسؓ کو دین کی سمجھ اور تاویل کی فہم عطا کر۔

"تاویل سے مراد قرآن کی تفسیر ہی ہے اور اس کی عبارت اور غایت کے اشاروں کو سمجھنا اور اگر تفسیر محدود

---

[1] فتح الباری جلد ۱ ص ۸۰

ہوتی۔ صرف اقوال تک جو وارد ہوئے تو آپ ابن عباسؓ کے لئے علّمہ (اسے سکھا دے) کے بجائے "احفظہ" اسے یاد کرا دے۔ فرماتے۔[۱]

تفسیر کا صحیح طریقہ | تفسیر قرآن میں نہ تو صرف نقل و روایت پر انحصار کرنا درست ہے اور نہ مجرد رائے اور عقل پر اعتماد کرنا مناسب ہے۔ بلکہ صحیح اور اعتدال کی راہ یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ صحیح طریقہ سے مروی ہے اس پر اعتماد کیا جائے اور اپنے مرغوبات اور بے جا تاویلات سے احتراز کیا جائے علامہ راغب اصفہانی دونوں فریقوں کے دلائل لکھنے کے بعد مقدمۂ تفسیر میں فرماتے ہیں۔

"غلو اور کوتاہ فہمی دونوں فریقوں میں پائی جاتی ہے۔ کیونکہ جس نے صرف منقول پر انحصار کر لیا اس نے ان تمام پہلوؤں سے صرف نظر کر لیا جس کی آئے دن ضرورت پڑتی ہے اور جس نے اجازت دی اس نے ہر اہل و نااہل کے لئے غور و خوض کی اجازت دے دی جس نے اپنی غرض کے لئے اس تفسیر بیان کرنی شروع کر دی۔ اور اس نے آیت تدبر کا لحاظ نہیں کیا۔"[۲]

امام غزالی بھی فرماتے ہیں:۔

" اس افراط و تفریط سے بچنے کے لئے صحیح اور درست طریقہ یہی ہے کہ فہم قرآن کے سلسلے میں جو کچھ مروی اور ماثور ہے، اس پر اعتماد کیا جائے۔ لیکن منقولات اور دلائل لغویہ کے پہلو بہ پہلو فہم و عقل کو کام میں لانا چاہیئے۔ تاکہ قرآن کریم کے دور رس۔ وسیع اور گہرے معانی کا استخراج کیا جا سکے اور کونی و نفسی حقائق کی گہرائیوں میں ڈوب کر گوہر مقصود کو حاصل کیا جائے۔ ظواہر کونیہ کا ادراک عقل اگر صحیح طور پر کرے گی تو قرآن میں رہنما اشارے بھی ضرور ملیں گے۔ شاید یہی حقیقت ہے جس کی طرف بعض صحابہ نے اشارہ فرمایا ہے۔

مثلاً حضرت ابو درداءؓ فرماتے ہیں۔

لا یفقہ الرجل کل الفقہ حتی یجعل للقرآن وجوھا[۳]	کوئی شخص فقیہ نہیں ہو سکتا جب تک وہ قرآنی الفاظ کے مختلف استعمالات کا علم نہ حاصل کرے۔

حافظ ابن حبان ابن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ

ان للقرآن ظاھراً و باطناً[۳] و حداً و مطلعاً۔	قرآن کے ظاہری معانی بھی ہیں اور علمی نکتے بھی۔ حلال و حرام بھی اور وعدہ و وعید بھی۔

---

۱ احیاء العلوم ص ۲۶۰ تا ۲۶۲ جلد ۱۔ ۲ تفسیر راغب ص ۴۲۳ ۳ الاتقان جلد ۱ ص ۱۴۱